بال جبرئیل

پروفیسر ڈاکٹر اینے میری شیمل کی کتاب

''اقبال کے دینی تصورات''

اشاعت جون ۱۹۶۳ء

پر ایک تنقیدی محاکمہ

مترجم
سید یوسف بخاری

سید عبدالواحد ۱

ڈاکٹر شیمل نے یہ کتاب جو اس وقت زیر نظر ہے ، اس مقصد سے لکھی ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے دینی تصورات کا مطالعہ کیا جا سکے ۔ کتاب کا عنوان کافی شاعرانہ ہے ۔ ''بال جبرئیل'' اقبال کے ساتھ اس کی مناسبت بالکل واضح ہے ۔ موصوفہ ، ڈاکٹر اینے میری شیمل بون یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور مطالعۂ اقبال کے باب میں کافی معروف بھی ہیں ۔

زیر نقد کتاب کی ضخامت ۴۴۲ صفحات ہے ۔ طباعت عمدہ اور جلد نفیس ہے ۔ کتاب میں جا بجا اقبال کے حوالے موجود ہیں جو آن کے وسیع مطالعۂ اقبال پر دال ہیں ۔ ہر صفحہ فاضل مصنفہ کے تبحر علمی اور دقت و امعان نظر کا بھی عکس ہے ، اور یہ تمام باتیں قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں ۔

---

۱ ۔ اقبالیات کے فاضل ، صاحب نظر و دراک مبصر ۔ ڈاکٹر اینے شیمل کی زیر نظر کتاب پر موصوف کا یہ مقالہ آن کی دقت نظر ، اقبال شناسی ، روح اقبال کی شرح اور فاضل مصنفہ کی فاش اغلاط کی بے لاگ تنقید ہے جس سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے اور کئی حقیقتیں و انکشاف ہوتی ہیں ۔

مگر صرف یہی کچھ نہیں ہے اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر سخن طرازی کی جا سکتی ہے ۔ کم از کم ایک بات تو صاف ظاہر ہے اور وہ یہ کہ جواں سال ڈاکٹر صاحبہ شاعرہ اور متصوف بھی ہیں اور تاریخ ادیان عالم اُن کے مطالعے کا خاص موضوع ہے ۔ ان تینوں رجحانات کی اُن کی اس کتاب میں نشان دھی کی جا سکتی ہے ۔ مگر غور سے دیکھئیے تو ان میں ہم آہنگی کچھ نہیں ۔ بس تینوں پہلو یک جا جمع ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کی یہی سب سے بڑی خامی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بعض زاویہ ہائے نظر سے دیکھیں تو یہ چیز اپنی جگہ ہے تو دلچسپ مگر ایک مستند کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت زیادہ معتبر نہیں سمجھی جا سکتی ۔ اگر ان تینوں رجحانات پر مناسب قدغن رکھا جاتا اور ایک معتدل خوش آمیزی سے کام لینے کی سعی کی جاتی تو غالباً یہی تینوں عناصر اس کتاب کی خوبی بھی بن سکتے تھے اور اس کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا ۔ جوں جوں آپ کتاب کا مطالعہ کریں گے آپ کو یہ بات محسوس ہوگی کہ مصنفہ کے ذہنی پس منظر کے یہ تینوں میلانات ایک دوسرے کے متخاصم بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے مجروح کن بھی ۔ اس اخلاط کے نتیجے میں پوری کتاب معلومات کا ایک گودام بن کر رہ گئی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل — گو شاعرہ قسم کی — مصنفہ نے جو جو چیز بھی اقبال پر دستیاب ہوئی اس کو ایک جگہ منظم کرنا شروع کر دیا ۔ اور اس عمل میں انہوں نے صرف اپنے رجحانات طبع سے سروکار رکھا ہے ۔ ربط و تہذیب کی کاوش سے وہ بالکل بے نیاز نظر آتی ہیں ۔ ہم اپنے اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے قاری کو سب سے پہلے مصنفہ کے مقدمے کے چند الفاظ سے روشناس کراتے ہیں ۔ فرماتی ہیں :

> ''اقبال اپنی شاعری میں جو علائم و رموز استعمال کرتے ہیں اُن کو سہل ، معقول اور تجزیاتی چھان بین کے ساتھ اب تک کسی نے بھی پیش نہیں کیا اور نہ کسی نے یہ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کسی خاص وزن کو شعر میں کیوں برتتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اب تک شعری تکنیک پر کوئی غور نہیں کیا گیا ہے ۔''

یہاں پر قارئین یہ سوچنے اور سوال کرنے پر مجبور ہوں گے کہ جب اس کتاب کا بنیادی مقصد اقبال کے دینی تصورات کی نشان دہی ہے تو اس کی شعری تکنیک پر بحث کا اس موضوع سے کیا تعلق ہے؟ بہر کیف، ہم جوں جوں آگے بڑھتے جائیں، کتاب میں ایسی ہی بوالعجبیاں نظر آئیں گی۔ مثلاً کتاب کے صفحہ ۵۹ پر ایک تاریخ وفات درج کی گئی ہے جس کو اقبال ہی کے کسی مصرع سے مشتق بتایا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال نے اپنی تاریخ وفات کا مادہ اس مصرع میں خود ہی کہہ دیا تھا۔ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادۂ تاریخ وفات کا اقبال کے دینی معتقدات کے موضوع سے کیا تعلق ہے؟

مصنفہ اسی طرح کا ایک اور قصہ بھی لے بیٹھی ہیں۔ اقبال کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع دیتی ہیں کہ:

> ''اسلامک کلچر میں پہلے یوم اقبال کا ذکر ملتا ہے جو حیدرآباد دکن میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بھی ایک لیکچر دیا تھا جس کا موضوع تھا ''اقبال کا فلسفۂ مرگ''۔ ڈاکٹر یوسف حسین بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔''

یہاں بھی وہی سابقہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دلچسپ اطلاع یا معلومات کے اس خزینے کو اقبال کے دینی نظریات کے مبحث سے کس طرح متعلق سمجھا جائے؟ غرض اس قسم کی دور از مبحث باتوں کا کتاب میں جا بجا تذکرہ ہے جن کی مثالیں پے در پے دینا لاحاصل ہے۔ کتاب کو اقبال کے بارے میں لاتعلق معلومات کا ایک دفتر بنا دیا گیا ہے جو اپنی جگہ دلچسپ تو ضرور ہیں مگر قاری کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کا کتاب کے عنوان و موضوع سے کیا رابطہ ہے۔ اس لیے قاری کے ذہن کا پراگندہ ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔

ہمیں اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اقبال اپنے افکار کی بوقلمونی اور ہمہ گیر وسعت کے اعتبار سے ایک عظیم نابغہ تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس کو سمجھنے میں بھی اشکال ہو سکتا ہے اور اس پر

عمومی اظہار خیال کرنا اور بھی مشکل ۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ جب گفتگو ایک ایسی متبحر علمی شخصیت کی ذات و صفات اور کمالات پر ہو تو آدمی جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو اقبال کے صرف چند پہلوؤں تک ہی محدود رکھے ۔ بنابریں بادی النظر میں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شیمل اقبال کے دینی تصورات کے موضوع پر کچھ لکھ رہی ہیں تو بڑا اطمینان ہوتا ہے ، مگر واقعہ یہ ہے کہ موصوفہ کو اقبال کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ کہنے کی لگن تو تھی تاکہ اقبال کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے ، لیکن وہ اصل موضوع سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں ۔ اور باوجود ایک ماہر اقبال ہونے کے وہ اس عظیم اور پہلودار شاعر کے مطالعے کا وہ حق ادا نہ کر سکیں جس کی اُن سے توقع تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے معلومات تو کافی فراہم کی ہیں اور ہر مأخذ سے کام لیا ہے ، مگر اُن کے اکثر مأخذ معتبر نہیں ہیں ۔ ہم یہاں سر دست اُن کے دو مأخذ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں :

فاضل مصنفہ نے W. C. Smith کی کتاب ''ماڈرن اسلام ان انڈیا'' کا بار بار حوالہ دیا ہے ۔ یہ کتاب اولاً ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی تھی ۔ راقم السطور کو غالباً ۱۹۵۰ء میں جناب سمتھ سے کراچی میں ملاقات کا اتفاق ہوا ۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب میں انہوں نے جو خیالات اور آراء قلم بند کیے ہیں وہ واقعی غلط تصورات پر مبنی اور ناقابل تسلیم ہیں ۔ بلکہ یہاں تک مان گئے کہ اب اُن کے وہ خیالات نہیں رہے جو اُنہوں نے اُس وقت کتاب میں درج کیے تھے ۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جناب سمتھ جن باتوں کو خود ہی ماننے کے لیے تیار نہیں ، ڈاکٹر شیمل اُن سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہیں ۔ چنانچہ فرماتی ہیں :

> ''ڈبلیو ۔ سی ۔ سمتھ نے اقبال کو ایک جگہ ترقی پسند دکھایا ہے اور ایک جگہ رجعت پسند ۔ سمتھ نے اقبال کی ان دونوں حیثیتوں کو اقبال کے اپنے الفاظ اور اُن شارحین و مداحین کے الفاظ و تاویلات سے ثابت کیا ہے'' (ص ۳۷۸)

صفحہ ۶۰ اور ۶۴ پر مصنفہ نے ایک صاحب ڈاکٹر لوسا کا ذکر کیا ہے اور اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو ''مکتوبات اقبال'' میں شامل ہیں ۔

ڈاکٹر لوسا اور اُن کے خطوط کا ذکر کرتے وقت غالباً ڈاکٹر شیمل کو یہ بات معلوم نہ ہو گی کہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر (مرحوم) نے حتمی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ڈاکٹر لوسا کے نام اقبال سے منسوب بیشتر خطوط قطعی جعلی ہیں ۔ شیخ عطا اللہ 'مکتوبات اقبال' کے ان تھک مدون و مرتب ہیں ۔ انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ مکتوبات کے آیندہ ایڈیشن میں ڈاکٹر لوسا کے نام ایسے تمام جعلی خطوط کو خارج کر دیں گے ۔ طے پایا ہے کہ جو خطوط خود اقبال کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے دستیاب ہوں گے صرف اُنہیں کو معتبر اور مستند سمجھا جائے گا ۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر شیمل ان تمام حقائق سے بالکل بے خبر ہیں اور اپنی کتاب میں ڈاکٹر لوسا کے نام اقبال کے خطوط کا ذکر چھیڑ بیٹھی ہیں ۔

ڈاکٹر شیمل کی یہ کتاب ڈاکٹر بلیکر کے ایما پر لکھی گئی ہے ۔ صاحب موصوف ''تاریخ ادیان عالم'' کی مجلس کے سیکرٹری ہیں ۔ پروفیسر شیمل انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ الٰہیات میں رہ چکی ہیں اور تاریخ ادیان عالم پر لیکچر بھی دیا کرتی تھیں ۔ مگر یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے اُن کی تقرری کے سلسلے میں یہ پابندی لگا دی تھی کہ چونکہ وہ مذہباً عیسائی ہیں اس لیے یہاں اسلام پر لیکچر نہ دیں ۔ اس تحدید نے اُن کی طبع رسا کو روکے تو رکھا ، مگر جب ڈاکٹر بلیکر نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی تو موصوفہ اس عنوان پر طبع آزمائی کرنے سے باز نہ رہ سکیں ۔ چنانچہ انہوں نے یہ کتاب پیش کر ہی دی ۔

اس کتاب کے موضوع کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اقبال کو بحیثیت مسلمان پیش کرتیں اور اسی موضوع پر ساری گفتگو مرتکز رکھتیں ۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اقبال کو اپنے اسلام پر جس درجہ ناز تھا اس کا اظہار انہوں نے بار بار کیا ہے ۔ اقبال نے مرنے سے عین قبل اپنے بھائی سے کہا تھا : ''میں مسلمان ہوں اس لیے موت سے کیا ڈروں گا ۔'' ڈاکٹر شیمل کو چاہیئے تھا کہ وہ ان الفاظ سے ہی اپنے موضوع کی ابتدا کرتیں اور بتاتیں کہ اقبال نے اسلام کی روح کو کس طرح سمجھا تھا ۔ اسلام کے عقائد اور ایمانیات کی تشکیل اور شرح نو ، اقبال کے ہاں کس کس عنوان سے نظر آتی ہے ۔ اس کا ذکر بڑی عمدگی اور

تفصیل سے لایا جا سکتا تھا مثلاً اقبال نے جن دینی اُمور پر گفتگو کی ہے، اُن میں سے چند یہ ہیں :

۱ - تقویٰ الٰہ ۲ - تصور ابلیس ۳ - اجتہاد ۴ - تقلید ۵ - فری ول (ارادۂ انسانی کی آزادی) ۶ - بہشت و دوزخ (محسوس مقامات کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدارج روح کے اعتبار سے) ۷ - مشروط جاودانی وغیرہ -

اگر ڈاکٹر صاحبہ یورپی قارئین کو اقبال کے دینی معتقدات کے باب میں با خبر کرنا چاہتی تھیں تو سب سے پہلے تو اُن کو یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ اسلام کیا ہے - ایسے ابواب شامل کتاب ہونے چاہیئے تھے جو یہ واضح کر سکتے کہ اسلام کیا بتاتا اور سکھاتا ہے اور یہ کہ بر صغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کیا رہی ہے - جب تک یہ دونوں پس منظر موجود نہ ہوں یورپین قاری اقبال کے تصور دینی تک کیونکر رسائی پا سکے گا ؟ مگر موصوفہ نے اپنی کتاب کو کچھ اور ہی بنا دیا ہے - طرز نگارش شاعرانہ رکھا ہے اور بڑا بلند پایہ۔ مگر جو چیز کتاب کی شکل میں مرتب ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے وہ کچھ اور ہی کہتی ہے - یہی ہمارے اس تبصرے کا موضوع ہے -

کتاب کا پہلا باب ان چار فصلوں پر مشتمل ہے :

۱ - تاریخی پس منظر
۲ - حیات اقبال
۳ - اقبال کے کلام کا جمالیاتی پہلو
۴ - اقبال کے دینی محرکات

تاریخی پس منظر کی فصل میں ڈاکٹر صاحبہ نے پورے بر صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ بیان کر ڈالی ہے - پھر بتایا ہے کہ اُن کے عروج و زوال کی داستان کیا ہے - اس ضمن میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رح اور سر سید رح جیسے مصلحین ملت پر بھی اختصاراً کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیا ہے - یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ اُن میں روحانی اور اخلاقی پستی بھی رونما ہوئی - اس لیے بڑا ضروری تھا کہ سیاسی حالات و کوائف بھی اپنے

صحیح تناظر کے ساتھ پیش کیے جائیں۔ مگر کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سیاسی زوال، روحانی و اخلاقی پستی کے جلو میں ہی پیدا ہوتا چلا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں مسلمان سیاسی طور پر مستحکم اور بہت مضبوط حالت میں تھے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ الحاد نے بھی اپنا سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور ایک عظیم دینی قوت کی حیثیت سے اسلام کو پہلا دھچکا اسی عہد میں پہنچا۔ بہر نوع جہاں تک اس فصل کا تعلق ہے وہ بہت عمدگی کے ساتھ قلم بند کی گئی ہے۔ البتہ اس کا وہ حصہ بڑا ہی مایوس کن ہے جس میں شاہ جہاں کی جا نشینی کے قضیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ اس بات کی علت و سبب تک پہنچ ہی نہیں سکی ہیں کہ اورنگ زیب کو اپنے بھائیوں کے خلاف جو سخت قدم اٹھانے پڑے اس کی اصل تاریخی وجوہ کیا تھیں۔ اس ضمن میں موصوفہ کو لازم ہے کہ ان قابل قدر سلسلہ ہائے مضامین کا مطالعہ کریں جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ''تاریخ تحریک آزادی'' کے ضمن میں شائع کیے ہیں۔

حیات اقبال کے سلسلے میں ڈاکٹر شیمل نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مختصر نوٹ کی صورت میں ہے مگر ہے کافی معقول۔

''اقبال کے کلام کے جمالیاتی پہلو'' پر جو فصل لکھی گئی ہے وہ بھی بڑی حد تک مایوس کن ہے۔ اقبال کے جمالیات پر پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور پروفیسر عابد علی عابد نے بڑا مفصل مواد تحریر کیا ہے۔ گو آج بھی اس باب میں بہت کچھ کام کرنا باقی ہے مگر مصنفہ نے جو کچھ ہمیں اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اسے کوئی نیا نتیجۂ فکر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس سے ہماری معلومات میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس فصل میں بھی ڈاکٹر صاحبہ نے بعض باتیں ایسی کہہ دی ہیں کہ ان کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ صفحہ ۳۶ پر لکھتی ہیں:

> ''یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب اقبال شاعری اور شعراء کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد اور خلائق کی تباہی پر کوئی پیغمبر بری طرح غصہ اتار رہا

ہے ، مگر جب اپنے مذہبی معتقدات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں تو شاعری کا وہی رنگ قدیم اختیار کرتے ہیں اور شعری پیکر بھی وہی کلاسکی ہے ، گو بڑا ہی بلیغ اور بلند پایہ ۔ اسلوب نگارش میں علائم و رموز بھی وہی برتے ہیں جو آن کے پیش رو برتتے چلے آئے تھے اور جن پر وہ اس بری طرح برستے ہیں ۔''

ان آراء سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو اقبال کے ادبی مقام کے باب میں بڑی سخت غلط فہمی ہے ۔ اگر فاضل مصنفہ اقبال کی ادبیات پر ایک غائر نظر ڈالیں تو انہیں خود محسوس ہوگا کہ آن کے یہ خیالات حقیقت میں کس قدر بے اصل اور غیر منصفانہ ہیں ۔

یقیناً ایک جگہ مصنفہ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ '' اقبال کی غزلیں اکثر بڑی بلند و پاکیزہ ہیں ۔'' (ص ۶۹) ۔ مگر ان غزلوں پر انہوں نے جب یہ خیال ظاہر کیا تو ہمارا متعجب ہونا بے محل نہیں :

'' بقابلتہً اقبال نے شعری علائم کم ہی تعداد میں برتے ہیں ۔ کوئی تیس سال تک ایک اور بس ایک ہی بنیادی خیال ہے جسے دھرائے چلے گئے ہیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ عشقیہ موضوعات پر آن کا ذاتی تاثر بھی کہیں نظر نہیں آتا ۔ ان تمام باتوں نے اقبال کو ایک ملہم تصورات تو بے شک بنا دیا ہے مگر کلاسکی مفہوم میں ہم جسے شاعر کہتے ہیں وہ اقبال نہیں ہیں ۔'' (ص ۷۰)

ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے !

مصنفہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶۴ پر ایک اور نئی بات چھیڑ دی ہے ۔ فرماتی ہیں :

'' اقبال کو بیرون در کھیلے جانے والے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ اسی لئے وہ اسلام کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں تفریحات کی کوئی گنجائش نہیں ۔''

یہ صحیح ہے کہ اقبال کھیلوں اور کھلی ہوا کی ورزشوں میں عام طور پر کوئی حصہ نہ لیتے تھے ۔ گو جوانی میں پہلوانی سے کچھ شوق ضرور رہا تھا ، مگر جہاں تک بعض فرشی کھیلوں یا معصوم تفریحات کا تعلق ہے وہ ایسے بدذوق بھی نہ تھے ۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نجی محافل موسیقی اور مجالس طرب سے وہ بھی لطف لیا کرتے تھے ۔ ستار بجانے کا بھی چند سال شغل کیا ۔ مگر اس زمانے کے لغو اور مخرب اخلاق کھیل تماشوں سے وہ ہمیشہ متنفر رہے ۔ چنانچہ سنیما بینی اور نائٹ کلب جیسے مشاغل تفریح کو انہوں نے کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ۔

اقبال کے دینی تصورات کی فصل میں یوں تو کوئی خاص بات قابل غور نہیں ، البتہ صفحہ ۳۷ پر مصنفہ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں ۔ فرماتی ہیں :

> ''اپنے خطبات میں اقبال نے دینی اظہارات کے دو پہلوؤں 'متصوفانہ' اور 'ملہمانہ' پر طویل تجزیاتی بحث کی ہے اور اس ملہمانہ اظہار کے باب میں اپنے شدید میلان کو ظاہر کیا ہے کیونکہ یہی انسان کی حیات روز مرہ میں سب سے زیادہ نمود حاصل کرتی ہے ۔''

مگر فاضل مصنفہ نے بڑی ہوشیاری یہ کی ہے کہ ''ملہمانہ اظہار'' کی وضاحت کہیں نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوفہ جب بھی اقبال پر نکتہ چینی کرتی ہیں تو اپنی رائے کو ملائم کرنے کے لئے '' ملہمانہ '' کے لفظ کی آڑ لیتی ہیں ۔ غرض یہ اصطلاح انہیں بہت مرغوب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اکثر جگہ یہی وضع تحریر نظر آتی ہے جیسے '' ملہمانہ روح '' ، '' ملہمانہ فلسفہ '' ، '' ملہمانہ شاعری '' وغیرہ ۔ یوں تو یہ اصطلاح درست ہی ہے ، بالخصوص ایسے ملک میں جہاں ابھی تک پیغمبروں کا احترام موجود ہے ، لیکن '' ملہمانہ شعراء '' سے رومیوں نے جو مراد لی تھی وہ Vates یا کاہن اور فالگو قسم کے لوگ تھے ۔ اس لئے اگر فاضل مصنفہ کو اقبال کی تحقیر ہی کرنی تھی تو سیدھے سادے الفاظ میں یہ جرأت کرتیں اور ایسے متصوفانہ مصطلحات کی آڑ نہ لیتیں ۔ بہر نوع مصنفہ کی نیت کا فتور اور انتشار ذہنی اس سے مترشح ہے ۔

صفحہ ۹۷ پر تحریر فرماتی ہیں :

'' جس طرح یورپ میں یہ آواز اٹھی کہ عیسائیت سے گریز کر کے مسیح کے بے داغ پیغام کی طرف لوٹا جائے اسی طرح اقبال بھی ''مسلمیت'' کو چھوڑ کر اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں ۔''

اس ضمن میں وہ '' زبور عجم '' جزو ۲ صفحہ ۵۶ کے اس شعر کی طرف ہمارا ذہن منتقل کرانا چاہتی ہیں :

برون آ از مسلماناں گریز اندر مسلمانی
مسلماناں روا دارند کافر ماجرائی ہا

صاف ظاہر ہے کہ فاضل مصنفہ نے شعر کا مطلب سمجھنے سے پہلوتہی کی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال دکھی انسانیت کے لیے نجات کا راستہ صرف اسلام میں دیکھتے ہیں، مگر یہ اسلام وہ اسلام ہے جسے وہ جانتے اور محسوس کرتے ہیں ، نہ کہ وہ اسلام جسے یورپ نے سمجھ رکھا ہے یا جو کٹ ملاؤں کی سمجھ میں آیا ہے ۔

کتاب کے باب دوم میں اسلام کے پانچ ارکان کے بابت اقبال کے تاثرات کا ذکر ہے ۔ باب سوم میں '' ایمان کے دیگر بنیادی عناصر'' پر گفتگو کی گئی ہے ۔ یہ دونوں ابواب کتاب کا اصل مغز ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی الہیات کے ضمن میں اقبال کے دینی تاثرات کیا ہیں ۔ ان ابواب کے مشمولات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے مصنفہ کی اصل غایت کیا ہے ۔ اکثر جگہ معلومات مکمل اور دلچسپ پیرائے میں ہیں ، مگر یہاں بھی ربط مضمون اور ہم آہنگی کا فقدان نظر آتا ہے ۔ منطقی استدلال کی کمی اور خلط مبحث علیحدہ ہے ۔ اس لیے مصنفہ کے اصل مافی الضمیر کو سمجھنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے ۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کا مقصد فہم اقبال میں مدد دینا نہیں ہے ، بلکہ اپنی علمیت و فضیلت کا رعب ڈالنا ہے ۔ گو اس میں شک نہیں کہ مصنفہ کی علمیت کافی وسیع ہے اور اس سے یوں بھی کسی کو انکار نہ ہوتا ۔

اب ہم مصنفہ کے افکار و آرا پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ فاضل مصنفہ ''ملہمانہ توحید'' اور ''متصوفانہ توحید'' میں فرق کرتی ہیں۔ مصنفہ پر واضح ہوگا کہ اسلام توحید کے معاملے میں تو کسی عنوان سمجھوتے پر آمادہ ہی نہیں۔ اس میں توحید ایک اور صرف ایک ہی ہے جیسا کہ خود اس لفظ کا اپنا تصور ہے۔ فرمان خداوندی ہے :

ان اللہ لا یغیر ان یشرک بہ (القرآن ۴ : ۴۸)

اقبال نے کہا ہے :

'' یہ نیا کلچر اتحاد عالم کی بنیاد توحید پر رکھتا ہے۔''

خود مصنفہ کو بھی یہ اقرار ہے :

'' اقبال کے تصور میں تخلیقی توحید کی امثلہ اگر ملتی ہیں تو قدمائے تصوف میں جیسے بایزید بسطامی یا ابوذر میں، یا پھر معماران ملت اسلامیہ میں یعنی سلاطین سلجوقی طغرل و سنجر۔''

جب بات صرف اتنی سی ہے تو توحید کی درجہ بندیاں کرنے کا جواز کہاں سے نکل آیا؟ توحید اور رسالت کے مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل مصنفہ نے اقبال کی خودی کا فلسفہ بھی لیا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کیا ہے، یہ بھی معرض بحث میں آیا ہے۔ انسانی خودی کی تقویت کے لیے جو عناصر درکار ہوتے ہیں مثلاً عشق، قوت اور اسلام میں شخصیت کا تصور وغیرہ سب ہی چیزیں سامنے آ گئی ہیں۔ انسانی خودی کے ارتقا میں کشاکش کا وجود اقبال کے نزدیک لابدی ہے۔ اس بات پر مصنفہ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے :

'' اثبات و نفی کی منطقی کشاکش، مثبت و منفی قطبین کی کشاکش ہی ہے اور یہی شے زندگی کو ہر مرحلے میں قائم و برقرار رکھتی ہے۔ برقی اور مقناطیسی کرنٹ سے لے کر روحانیت کے سدرۃالمنتہیٰ تک یہی عالم چھایا ہوا ہے۔''

ذات باری تعالیٰ پر پروفیسر نکلسن کی جو رائے ہے ، مصنفہ کو اس پر بالکل صحیح تعجب ہوا ہے ۔ پروفیسر نکلسن کا کہنا ہے کہ عیسائیت میں 'ذات الہ' کہا گیا ہے ، اسے کسی مسلم زبان میں ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا ۔'' مگر اس سے بھی بڑھ کر تعجب خیز بات یہ ہے کہ خود ایک مسلمان مفکر ، خلیفہ عبدالحکیم ، بھی پروفیسر نکلسن کی اس رائے سے متفق ہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بعض مفکرین کو اس بات کا یقین ہے کہ ''قدیم تصوف اسلام میں جو یہ مسلمہ ہے کہ ذات کا اصل سرچشمہ و پیکر صرف ذات الہ ہے'' ، ''ذات باری تعالیٰ'' کی ترکیب بڑی خوبی سے اس کے پورے مفہوم کا احاطہ کرتی ہے ۔

توحید کے ذیل میں مصنفہ نے ''ضدین'' پر بحث کی ہے جیسے 'خلوت و جلوت' 'جلال و جمال' 'ذکر اور فکر' وغیرہ ۔ یہ تذکرہ بھی کافی دلچسپ ہے مگر قصہ یہ ہے کہ اصل موضوع کو اس خلط مبحث نے مجروح کر دیا ہے ۔ اب مثلاً عشق پر ہی چند سطریں ملتی ہیں تو وہ بھی سطحی سی ہیں ، حالانکہ 'عشق' اقبال کے ہاں ایک ایسا مسئلہ ہے جو اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک پورے باب کا تقاضا کرتا ہے ۔ مگر یہاں مصنفہ نے چند سطور پر ہی اکتفا کیا ہے ۔ ہم خود بھی یہاں اس موضوع پر زیادہ کہنے کا محل نہیں پاتے ، اس لیے صرف حوالہ دینے پر قناعت کرتے ہیں ۔ مصنفہ کے الفاظ یہ ہیں :

> ''بہر نوع یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ اقبال اس اصطلاح سے کہ عشق خدا کا حرف اور پیامی ہے اور یہ کہ اقبال کے ہاں بھی عشق کا وہی مفہوم ہے جو مسیحیت میں ہے ۔''

میرا خیال ہے کہ مصنفہ کی اس رائے پر بھی کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ :

> ''اسلام میں فنون لطیفہ کے وجود پر اقبال سخت چیں بہ جبیں ہیں ۔''

مصنفہ نے صفحہ ۱۴۵ پر ''ضرب کلیم'' کے جو اشعار نقل کیے ہیں اور اُن پر رائے زنی کی ہے وہ یا تو مصنفہ کا سہو ہے یا طباعت کی غلطی۔ ''ضرب کلیم'' اور ''زبور عجم'' کی نظموں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

الٰہیات اسلامیہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ ایک وجود انسانی سمجھنے پر زور دیا ہے تا کہ محبت رسول میں غلو مسلمانوں سے وہ حرکت سرزد نہ کرا دے جو دوسرے ادیان کے پیروؤں سے ہوئی جنہوں نے نتیجۃً اپنے پیغمبروں کو الوھیت کا درجہ دے دیا۔ اسلام اس قسم کے کسی صنم تو کیا صنم اکبر تک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ عشق رسول کا درجہ مسلمانوں میں اپنے منتہیٰ تک دکھائی دیتا ہے اور یہ اُس ذات ستودہ صفات کی محبت اور جذبہ ہی ہے جس نے مسلمانان عالم کی ہر زبان میں نفیس ترین اشعار تخلیق کرائے ہیں کیونکہ ہمارا تو ایمان ہی اُس وقت کامل و مکمل ہوتا ہے جب رسالت پر ایمان لائیں اور ذات رسول کی محبت اور اُس کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق پیدا کریں۔ اقبال بھی اسی جذبے سے سرشار ہیں بلکہ اپنے وجود کو ہی حب رسول سے مشروط سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ عشق محمد ہی تھا جس نے اقبال سے کئی بلند و ارفع نظمیں کہلوائیں جو محبت رسول کی بدرجۂ اتم آئینہ‌دار اور کیف و سرور شعری کی بھی بڑی ممتاز مثالیں ہیں۔ مثلاً ''رموز بے خودی'' کے آخر میں چند اشعار اور ''ارمغان حجاز'' کی رباعیات۔ خود کتاب کی مصنفہ کو بھی اقرار ہے:

> ''اقبال کے چند نہایت نفیس اور بلند پایہ اشعار مدحت رسول میں ہیں اور ''جاوید نامہ'' میں موجود ہیں۔ دیکھیئے ''فلک مشتری'' جہاں حلاج اقبال کو اسرار و مقامات نبوت سے آگاہ کرتے ہیں۔''

اقبال اور حلاج کے موضوع پر کئی پاکستانی مفکرین نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حلاج کے بارے میں اقبال کا علم و تاثر مشہور فرانسیسی صوفی عالم ماسینیون (Massignon) کی کتاب سے مستفید ہوا اور یہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہے کہ حلاج کے باب میں اقبال کے خیالات میں جو

تبدیلی آئی وہ ماسینیوں کی کتاب سے ہی آئی ۔ اس موضوع پر ہم موجودہ مقالے کے آخر میں پھر گفتگو کریں گے ۔ بہرکیف اس موضوع پر ابھی مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے جس سے نہایت دلچسپ انکشافات کی توقع ہے ۔ لیکن افسوس کہ ڈاکٹر شیمل اس موضوع کو بھی سرسری طور پر چھو کر گزر گئی ہیں اور اس پر خاطر خواہ وقت صرف نہ کر سکیں ۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کو ذات محمدی سے گہری اور بے پناہ محبت تھی اور جذبے کی اس شدت کے باعث وہ حضرت محمد صلعم کو اللہ سے نزدیک ترین ہستی سمجھتے تھے ۔ اسی احساس بلیغ نے اقبال سے بزبان حلاج یہ کہلوایا ہے :

عبدہ ، از فہم تو بالا تر است زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جس وقت '' جاوید نامہ '' طبع ہوا تو اس شعر پر بڑی لے دے ہوئی تھی اور منجملہ دیگر حضرات کے مولانا اسلم جیراجپوری جو بڑے جید عالم اور اقبال کے دوست بھی تھے ، اس پر سخت معترض ہوئے تھے اور فرماتے تھے کہ خود فرمان نبوی کی موجودگی میں اس شعر کی تطبیق کیسے کی جاسکتی ہے۔ بہرنوع اس موضوع پر بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے ۔ خود لفظ '' عبدہ '' بھی صراحت طلب رہا ہے اور اب بھی اس باب میں کام کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ اقبالیات کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ جناب بشیر احمد ڈار صاحب اس موضوع پر قلم اٹھانے کی فکر کر رہے ہیں ۔ امید ہے کہ وہ جلد اس کام کو مکمل کر سکیں گے ۔ بچہ بچہ اس بات سے واقف ہے کہ اقبال کو ذات محمدی سے کیسا والہانہ عشق تھا ۔ پاکستان میں اس موضوع پر کافی کتابیں لکھی جاچکی ہیں ۔ ڈاکٹر شیمل کے لئے اقبال کے عشق رسول پر کچھ کہنے کی بہ نسبت یہ بہتر تھا کہ وہ ''عبدہ'' کے موضوع پر زیادہ بسط کے ساتھ لکھتیں۔

علمائے سلف میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور حضرت اسمعیل شہید کے درمیان اس بات پر بڑی بحث چلی تھی کہ کوئی دوسرا محمد پیدا ہوسکتا ہے یا نہیں ۔ اس بحث میں غالب نے بھی حصہ لیا تھا ۔ ڈاکٹر شیمل نے اس کا کچھ خلاصہ اپنے ہاں شامل بھی کیا ہے ۔ ہم یہاں غالب کے وہ اشعار جو مثنوی

میں اضافہ کیے گئے تھے ۔ ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کی اطلاع کے لیے درج کرتے ہیں :

منشاء ایجاد دو عالم یکے است گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
جوہر کل ہر نتاید تثنیہ در محمد رہ نیابد تثنیہ

واضح بات ہے کہ غالب کے الفاظ '' جوہر کل '' نے اقبال کے ذہن پر بڑا اثر کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اقبال نے مشتری میں حلاج اور غالب کو یکجا دکھایا ہے ۔ مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر بوسانی کی تحریروں سے بالعموم وقیع علمیت کا اظہار ہوتا ہے ، مگر بعض دفعہ وہ بھی بے محل بات کہ جاتے ہیں اور کہنے سے پہلے بات کو تولتے نہیں ۔ اول تو یہ مبحث ہی بے محل ہے، تاہم پروفیسر بوسانی نے جو استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ قران کی سورہ (۳۵ : ۱) اور اقبال کے اپنے خیالات جو خطبات (انگریزی) کے صفحہ ۱۰ پر نظر آتے ہیں ختم نبوت کے معاملے کو مشکوک بنا دیتے ہیں (دیکھیئے پروفیسر موصوف کی کتاب ، صفحہ ۲۹۰)

ڈاکٹر شیمل نے اپنی کتاب کے اس حصے میں اسلام کے پانچ ارکان پر جو گفتگو کی ہے وہ اس انداز میں ہے کہ ہم یہاں اسے نظر انداز کرسکتے ہیں ، مگر دعا کے موضوع پر ان کا یہ خیال عجیب ہے :

> '' اقبال کی بہترین اور انتہائی شخصی بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گی کہ اقبال کی نمائندہ اور نمونے کی نظمیں وہی ہیں جو دعائیہ ہیں ۔ اگر آپ غور و تامل سے ان دعائیہ منظومات کو پڑھیں اور ان کا تجزیہ کریں تو اقبال کے مذہبی خیالات کی تشکیل جدید کا سراغ مل سکتا ہے ۔''

یہاں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اقبال کے مذہبی خیالات کی '' تشکیل جدید '' سے آخر کیا مطلب ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنفہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ دین کے معاملے میں اقبال کی '' غلط فہمیاں '' کیا ہیں ؟ ۔ ' اقبال اور دعائیں ' کے موضوع پر ڈاکٹر شیمل کے تصورات سے ہم بخوبی آگاہ

ہیں - وہ اپنی جگہ دلچسپ بھی ہیں اور عالمانہ بھی - مگر اقبال کی دعاؤں میں جو سوز دروں ، جو والہیت ، جو اضطراب و التہاب اور جوشش دری و خود رفتگی ہے اس تک مصنفہ بھلا کہاں پہنچ سکتی ہیں؟ اس لیے وہ اس باب میں بھی رسمی اور سطحی بات کر رہی ہیں - ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اقبال کی دعاؤں کا جو خوبصورت تجزیہ مرتب کیا ہے ، قارئین اس کا ضرور مطالعہ کریں -

ہمیں کتاب کے باب سویم پر زیادہ تفصیلی گفتگو کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی- اس میں اقبال کی قدح کرنے کے سوا مصنفہ نے اور کچھ نہیں کیا ہے - بہرکیف ہم اس پر بھی کچھ عرض کریں گے مگر ان سطور کے آخر میں - کتاب کے صفحہ ۲۰۸ پر ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں :

> ''ابلیس (شیطان) کو عام طور پر ایک فرشتہ مانا جاتا ہے مگر قرآن کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آتشیں پیکر جنات سے ہے -''

قرآن نہایت صاف لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ وہ تھا ہی جنوں میں سے : ''کان من الجن '' یہ کہ وہ راندۂ درگاہ ایک فرشتہ تھا عیسوی تصور تھا اور اسے اسلام قبول نہیں کرتا - لہذا اس بات پر مزید تبصرہ بے محل ہے -

باب چہارم کا عنوان ہے : اقبال پر مشرق و مغرب کے بعض تاثرات کا پرتو اور صوفیہ اور تصوف سے اقبال کا تعلق — چند جھلکیاں -''

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع اقبال کے دینی تصورات کا مطالعہ ہے ، مگر مصنفہ نے ایک پورا باب اقبال کے جمالیات پر بھی لکھ ڈالا ہے - اس پر ہی اکتفا نہیں بلکہ مشرق اور مغرب کے افکار نے اقبال کے ذہن پر کیا پرتو ڈالا یہ بھی ایک باب کا موضوع بن گیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کی وسعت تو پوری ایک بسیط کتاب کی محتاج ہے - اس لیے ہم یہاں صرف ایک جملے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے کے سوا اور کچھ نہ کریں گے - صفحہ ۲۱۸ پر ڈاکٹر شیمل لکھتی ہیں کہ '' یہی وجہ ہے کہ یورپی ثقافت کے بہت سے گوشے اقبال کے ہاں غریب اور مستور ہی رہے -''

یہ اقبال کے بارے میں بڑی واضح غلط بیانی ہے۔ اقبال نے تہذیب فرنگ کا ذاتی مشاہدہ کیا تھا اور یورپی تمدن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کا وقوف اقبال کی طبع رسا کو حاصل نہ ہو چکا ہو۔ حقیقت میں شاید ہی کوئی اقبال سے زیادہ اس باب میں باخبر ہو۔ غزالی اور ڈیکارٹ کا اقبال نے جو مقابلہ کیا ہے اس پر مصنفہ نے پروفیسر ہوسانی کی یہ رائے اپنے صاد کے ساتھ پیش کی ہے :

> ''جیلی کو ہیگل کے مقابلے پر اور ڈیکارٹ کو غزالی کے مقابلے پر لانے کا اصرار اس رجحان کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم مفتخر یورپینوں کے منہ پر کہا جا سکے : لیجیئے یہ ہیں ہمارے فلسفی ، ہمارے شیوخ جو آپ کی جدید ترین دریافتوں کے پیش رو تھے۔''

خوب ! اقبال نے ایک دفعہ کہا تھا : ''ڈیکارٹ کی ''Method'' اور غزالی کی ''احیاء العلوم'' کے درمیان اس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ ایک انگریز مصنف تو یہاں تک کہہ اٹھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی سے واقف ہوتا تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ ڈیکارٹ نے سب کچھ غزالی سے سرقہ کیا ہے۔'' (دیکھیئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس ۱۹۱۱ء میں اقبال کا خطبہ)

اب یہ پروفیسر ہوسانی اور پروفیسر شیمل کا کام ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اقبال اور اس کے انگریز مصنف نے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ سستی قسم کی پھبتیاں کسنا ایسے ذی علم لوگوں کو زیبا نہیں۔

صفحہ ۳۲۸ پر کہا گیا ہے :

> ''اقبال میں اخذ و اختیار مطالب کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ یورپی فلسفے سے اُن کے ربط اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ اُن کی خط و کتابت میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال مولانا ندوی کی تصریحات و اشارات کو بڑی زبردی کے

ساتھ سمجھ لیتے تھے اور انہیں اپنے فلسفیانہ نظام میں سمو لیتے تھے۔''

یہ بات اقبال اور مولانا سلیمان ندوی دونوں پر اتہام ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مولانا موصوف کوئی فلسفی نہ تھے اور نہ مغربی فلسفے کا انہیں کبھی کوئی وسیع علم ہوا۔ بنیادی طور پر وہ اسلامیات کے عالم اور خصوصی طور پر تاریخ اسلامی کے اختصاصی تھے۔ اُن کے جید عالم ہونے میں کیا شک ہے۔ اقبال اُن کی گہری علمیت کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مصنفہ کا یہ مفروضہ کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اقبال سلیمان ندوی سے ''استفادہ'' کرتے تھے اور ''بڑی زیرکی کے ساتھ اپنے نظام فلسفہ کا جزو بنا لیا کرتے تھے۔'' اصل بات یہ ہے کہ ایسے الزامات ہمیشہ ہی عائد ہوتے رہے ہیں۔ افلاطون اور پلٹن پر بھی ایسے ہی بہت سے اعتراضات جڑے جا چکے ہیں۔

اس باب کی دوسری فصل میں پروفیسر شیمل نے اقبال کے تصوف پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ حلاج اور رومی جیسے صوفیہ کا ذہن اقبال پر کیا اثر مترتب ہوا۔ افسوس کہ فاضل مصنفہ نے تصوف اقبال پر اُس شرح و بسط کے ساتھ بحث نہیں کی جس کا یہ مستحق ہے۔ یہ فروگزاشت اس لئے اور بھی افسوسناک ہے کہ موصوفہ کو تصوف، بالخصوص اسلامی تصوف، کا بڑا اچھا وقوف حاصل ہے اور اقبالیات کے شیدائی ان دنوں کچھ زیادہ ہی اس موضوع سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ بہر نوع اس باب کا یہ حصہ بڑی خوبی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار نہایت ضروری ہے کہ حلاج و رومی کے اقبال پر تاثرات کا ذکر کرتے وقت بہت سے ایسے تشنہ پہلوؤں پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے تھی جو ابھی تک ہمارے دائرہ علم میں نہیں آئے ہیں۔ مثلاً مصنفہ نے لکھا ہے کہ ''ہم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ حلاج کے باب میں اقبال کے معتقدات میں جو تبدیلی آئی وہ کس عہد میں آئی۔''

اس میں شک نہیں کہ اقبال کو پہلے حلاج کے سلسلے میں صرف روایتی معلومات ہی حاصل تھیں جو بعد ازاں گہرے اور تجزیاتی افہام تک پہنچیں مگر ماسینیوں کے واسطے سے اور خود اقبال کو بھی ماسینیوں کی اہم تصنیف کا

بڑا اعتراف تھا ۔ بایں ہمہ ماسینیوں کے مطالعے کے بعد بھی اقبال نے مولانا اسلم جیراج پوری کو ۱۹۱۹ء میں جو خط تحریر کیا تھا اس میں یہ ضرور ظاہر کر دیا تھا کہ حلاج کے خلاف فقیہوں نے جو فتویٰ دیا تھا اس میں وہ قطعی حق بجانب تھے ۔ الغرض مولانا اسلم کو یہ خط تحریر کرنے کے بعد حلاج کی شرعی سزا سے متعلق اقبال کے عقیدے میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کب ؟ ایک دلچسپ بات اور بھی ہے ۔ اقبال فرانسیسی زبان سے واقف نہیں تھے ۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی کا موجب ہے کہ ماسینیوں کی تحریر سمجھنے کے سلسلے میں اقبال کو کس سے مدد ملی ؟ فاضل مصنفہ نے اپنی کتاب میں ان نکات پر بھی قاری کی معلومات کو تشنہ رکھا ہے ۔

جب رومی کی طرف رجوع کریں تو ہمارے ماخذ و معلومات کی صحت مضبوط بنیادوں پر نظر آتی ہے مگر یہاں پر بھی مصنفہ نے سارے مبحث کو پھر خلط ملط کردیا ہے ۔ صفحہ ۳۸۶ پر لکھتی ہیں :

> ''۱۹۱۱ء کے لگ بھگ اقبال رومی کے باب میں اپنے انکشافات کا آغاز کرتے ہیں ۔''

اس بات سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو حقائق کا کچھ بھی پتا نہیں ۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ اقبال نے مثنوی مولانا روم کا اوائل زندگی ہی میں مطالعہ کر لیا تھا اور اغلباً سفر انگلستان سے پہلے اقبال اپنے دوست سوامی رام تیرتھ (۱۸۷۳ تا ۱۹۰۶ء) کو لاہور میں مثنوی کے اسباق دیا کرتے تھے ۔

۱۹۱۰ء میں اقبال نے اپنے کسی بیان میں یہ واقعہ اور تاثرات قلمبند بھی کئے تھے ۔ اب یہ کتاب کی صورت میں چھپ بھی گئے ہیں ، جسکا نام Stray Reflections ہے ۔ اس کتاب میں وہ بتاتے ہیں کہ کن مختلف شعراء کے کلام نے ان پر اثر کیا مگر اس میں وہ رومی کا کوئی ذکر نہیں کرتے ۔ بس اتنا کہتے ہیں کہ رومی حکایت لطیف بیان کرنے میں قابل تعریف شاعر ہیں ۔ رومی کا اولین ذکر ''اسرار خودی'' (۱۹۱۵ء) میں ملتا ہے ۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک

اقبال کیمبرج میں میکٹیگرٹ اور جیمز وارڈ کے زیر تربیت رہے ۔ لیکن ان اساتذہ کا اقبال پر اتنا اثر وہاں نہ ہوا تھا جتنا مراجعت وطن کے بعد ہوا ۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کو جرمن میں خاصی مدد بد حاصل تھی مگر نطشے کا گہرا مطالعہ اقبال اس وقت کر سکے جب اس عظیم فلسفی کی تالیفات انگریزی زبان میں دستیاب ہونی شروع ہوئیں اور یہ زمانہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء کا ہے ۔ اس وقت اقبال فرانسیسی زبان سے آگاہ نہ تھے اس لیے برگساں کا مطالعہ بھی محض واجبی سا رہا ہوگا تا آنکہ اس کی تصانیف انگریزی کے توسل سے مہیا ہوگئیں ۔ برگساں کی کتابیں ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۵ کے درمیانی عرصے میں انگریزی میں منتقل ہوئیں ۔ اب صورت یہ ہوئی کہ میکٹیگرٹ اور وارڈ کے بیشتر تصورات کو اقبال نے قبول کر لیا تھا ۔ اُدھر نطشے اور برگساں کی کتابیں بھی اقبال کے مطالعے میں رہ چکی تھیں ۔ رومی پر پہلے ہی عبور تھا اور اُن کا مطالعہ اس درجے کو پہنچ چکا تھا کہ کوئی حتمی تصور قائم کر سکیں ۔ چنانچہ اقبال نے یہ تحقیق کر لیا کہ ان تین مغربی مفکروں کے اہم تصورات رومی میں پہلے ہی موجود ہیں ۔ مثلاً یہ کہ میکٹیگرٹ کی طرح رومی بھی شخصیت کے غیر فانی ہونے کے قائل ہیں اور جیمز وارڈ theistic plurealism کی کثرت الوجود پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں ۔ مزید برآں نطشے کی طرح رومی بھی قدیم کے انہدام اور جدید کے انصرام پر زور دیتے ہیں ۔ رومی برگساں کی طرح اس کے بھی قائل ہیں کہ حقیقت کا اصل جوہر حرکت ہے اور علم کا سرچشمہ وجدان ہے ۔ یہی وہ تمام عناصر تھے جنہوں نے اقبال کو رومی کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنا شروع کیا ۔ اقبال نے رومی سے اکتساب فکر کیا اور یہ سلسلہ دراز تر ہوتا گیا ۔ چنانچہ اسرار کا سن اشاعت ۱۹۱۵ء ہے ۔ یہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء کے درمیان تخلیق کے مدراج سے گزری ۔ ان حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے رومی کا انکشاف ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء کے دور میں کیا ہوگا، غالباً ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء کے مابین ۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ اقبال نے رومی کی طرف جو توجہ کی اس کا اصل سبب صرف اُس کا تصوف ہی نہ تھا بلکہ اور عوامل نے بھی یہ تبدیلی پیدا کی ۔

یہاں یہ نکتہ بھی بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باب چہارم ، کتاب کے بقیہ حصوں کی طرح تضاد بیانی کا بری طرح شکار ہے ، نیز بہت سی

غلط معلومات بھی درج ہو گئی ہیں ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس باب کا مقصد ان تاثرات کی نشان دہی ہے جو ذہن اقبال پر مترتب ہوئے ۔ لیکن فاضل مصنفہ نے دکھایا ہے کہ حافظ ، غالب ، ہیدل ، گوئٹے اور ڈانٹے جیسے شعراء نے اقبال پر کیا اثر چھوڑا ۔ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے تعلقات کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی سراسر غلط اطلاعات پر مبنی ہے ۔ چونکہ ان تمام باتوں کا ایک مختصر تبصرے میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے ہم آگے بڑھتے ہیں ۔

ان تمام توضیحات سے قاری نے اس حد تک ضرور محسوس کر لیا ہوگا کہ یہ کتاب گو اکثر مقامات پر نہایت معقول و کار آمد معلومات سے خالی نہیں ہے لیکن اس میں جابجا نہایت سنجیدہ قسم کے اسقام بھی موجود ہیں جنہوں نے کتاب کو داغ دار بنا دیا ہے اور یہ ہمارا تلخ فرض ہے کہ ان اسقام کی طرف بالخصوص اشارہ کریں ۔

سب سے پہلی بات تو مصنفہ کی زبان ہے ۔ مقدمے میں محترمہ نے لکھا ہے : ''اس کتاب میں انگریزی کا جو اسٹائل آپ کو نظر آئے گا میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔'' جب مصنفہ یہ لکھ ہی چکی ہیں تو اب مزید گفتگو کرنا نا روا بات ہوگی اس لیے ہم زبان کے پہلو سے بالکل قطع نظر کرتے ہیں ۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کتاب کے صفحے کے صفحے نہایت بے داغ انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں لیکن جا بجا ایسی عبارات بھی آ جاتی ہیں جن کا سمجھنا ناممکن ہے یا پھر ایسے تاثرات کا اظہار ہے جن کو عجیب بھی کہا جا سکتا ہے اور غریب بھی ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کتاب کی مناسب انداز میں تدوین و تہذیب کیوں نہ کی گئی ۔ اگر تدوین مسودہ پر پوری توجہ صرف کی جاتی تو ظاہر ہے کہ ایسے تمام نقائص دور ہو سکتے تھے ۔ ہم بعض اسقام و اغلاط کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں :

صفحہ ۱۱۴ پر ''something irreal'' لکھا گیا ہے ۔ ہونا چاہئیے تھا : ''something unreal'' ۔ صفحہ ۱۶۸ پر لکھا ہے : رسالت کے finitude (ختم) کا کیا مطلب ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ بھی غلط برتا گیا ہے ۔ اصل میں

finality of prophet hood (ختم رسالت) ہونا چاہئیے ۔ صفحہ ۲۹۷ پر درج ہے : ''انسان لا نہایت میں حسن توازن اور ہر لمحہ ابدیت کے ساتھ اپنے آپ کو مدغم و متصل پاتا ہے ۔'' اس جملے کا مطلب کیا ہے ۔ اس کو آسانی کے ساتھ سمجھنا مشکل ہے ۔ کتاب میں ایسے الجھن پیدا کرنے والے فقرے جا بجا ہیں جن کی مثالیں دینا طوالت کا باعث ہوگا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے کتاب بڑی عجلت میں لکھی ہے اور اکثر مقامات پر واقعات کی تصدیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے ۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

صفحہ ۲۵ پر مصنفہ لکھتی ہیں : ''یہاں کلکتہ کے عالم اور سیاست داں خدا بخش کا کام قابل لحاظ ہے ۔'' صفحہ ۲۳۵ پر انہی صاحب کو متعارف کراتے ہوئے فرماتی ہیں ۔ ''خدا بخش وہ صاحب ہیں جنھوں نے شرع اسلامی میں تجدد پیدا کرنے کی کوشش کی ۔'' حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ صلاح الدین خدا بخش صاحب کلکتہ کے ایک وکیل تھے ، تعلیم انگلستان اور جرمنی میں حاصل کی تھی اور کلکتہ یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے لیکچرار بھی تھے ۔ آپ مولوی خدا بخش کے صاحبزادے تھے جنھوں نے پٹنہ لائبریری قائم کی تھی مگر وہ سیاست داں بالکل نہیں تھے اور نہ انہوں نے شرع اسلام میں تجدد کی کوئی کوشش کی ۔ صفحہ ۲۴۰ پر لیڈی عبدالقادر کو میدان سیاست کی نہایت سرگرم کارکن بتایا گیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ان معزز خاتون نے بھی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا ۔ صفحہ ۲۴۴ پر میر غلام بھیک نیرنگ کے نام اقبال کے خط کا اقتباس بلا سیاق و سباق دیا گیا ہے ۔ اس لیے قاری الجھن میں مبتلا ہو سکتا ہے ۔ اقبال کو ''سر'' کا خطاب ملنے پر میر صاحب نے انہیں ایک خط لکھا تھا ۔ یہ خط اس کا جواب ہے ۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کی فہرست خطابات میں جب اقبال کو ''سر'' کا خطاب دیا گیا تو ان کے بہت سے دوستوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ شاید اب اقبال حکومت پر کھل کر نکتہ چینی نہ کر سکیں گے اور وہ حرارت و تہور جو ان کے کلام کا جوہر تھا اب ختم ہو جائے گا ۔ ایسا ہی خط میر نیرنگ کا تھا ۔ اس پر اقبال نے جواب دیا تھا : ''دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو مجھے اعلائے کلمۃ الحق سے روک سکے ۔''

صفحہ ۱۳۷ پر اقبال کے ایک مضمون "قومیت اور اسلام" کا اقتباس دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ بالکل غلط کہا گیا ہے کہ یہ رموز بے خودی کے دیباچے سے اخذ کیا گیا ہے۔

صفحہ ۳۱۷ پر اقبال کے دو خطوط کے اقتباسات دئیے گئے ہیں جن میں ترجمے کی غلطیاں صاف ہیں۔ "سادہ لوح مسلمان طلبہ" کا لفظی ترجمہ عجیب و غریب کیا گیا ہے:

> لفظ pure tablet of the Muslim students سادہ لوح سے مراد 'بھولے' اور 'بیوقوف' ہو سکتے ہیں مگر سادہ لوح کے لیے pure tablet کے الفاظ استعمال کرنے کی داد نہیں دی جا سکتی!

یوں تو خیر یہ معمولی اسقام ہیں مگر ایک ایسی کتاب میں جو علمی وقعت کی نگاہ سے پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہو ایسے معائب و اغلاط کا ہونا بہت ہی افسوسناک ہے۔ ایسی چیزیں کتاب کو داغدار بنا دیتی ہیں۔

طرفہ تماشہ یہ کہ کچھ حصہ اقبال پر اتہام اور حملوں پر مشتمل ہے جن کی نوعیت کافی سنگین ہے۔ اس لیے بڑا ضروری ہے کہ ان کا مدلل اور مسکت جواب یہاں دے دیا جائے، ہم یہاں چند نکات پر ہی گفتگو کرتے ہیں اور مفصل مذکور کو کسی اور محل کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

(الف) صفحہ ۲۳۲ پر ترکی شاعر ضیا گوکلپ کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

> "اقبال کو ترکی نہیں آتی تھی۔ اس شاعر کے کلام سے واقفیت آگسٹ فشر کے جرمن ترجمے سے ہوئی۔ جب وہ اپنے خطبات میں اس کے کلام کے نمونے استعمال کرتے ہیں تو ترجمہ کرتے وقت بعض الفاظ کے یا تو معنی بدل دیتے ہیں یا انہیں حذف کر دیتے ہیں۔"

اس پر اگر نہایت شائستگی کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ مصنفہ نے یہ قطعی بے بنیاد الزام لگایا ہے جو بڑا سنگین ہے۔ اس

کا صریح مطلب تو یہ ہوا کہ مصنفہ کے نزدیک اقبال ذہنی بددیانتی کے مرتکب تھے اور یہ کہ وہ اپنے مطلب کی خاطر دوسروں کے الفاظ و معنی کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے تھے ۔

(ب) صفحہ ۲۲۹ پر فرماتی ہیں :

''غور کیجیئے، خودی کے نصب العین کو ثابت کرنے کے لیے اقبال اکثر آیات قرانی کے مطالب اپنی مرضی سے متعین کرتے ہیں ۔ اسی طرح روحانی تکمیل و ارتقا ' حرکت وغیرہ کے باب میں وہ قران سے حسب المراد تعبیرات لاتے ہیں ۔''

(ج) صفحہ ۳۸۵ پر یہ الفاظ نظر آتے ہیں :

''اقبال اکثر کلام الہی کی تعبیر بہت شخصی قسم کی کرتے ہیں جو قرانی الہامات کو جدید سائنس کے تجربات سے مطابق کرنے کی خواہش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔''

اس سلسلے میں یہ بات یاد رھنی چاھیئے کہ ایک دفعہ موصوفہ نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ دنیا کو یہ بتائیں گی کہ اقبال نے آیات قرانی کا کس طرح دانستہ ترجمہ غلط کیا ہے ۔ اس بات پر آن سے کہا گیا تھا کہ اقبال کو کسی آیت قرانی کا غلط ترجمہ کرنے کی ضرورت ھی نہیں تھی ۔ انہوں نے تو صرف اتنا ھی کیا ہے کہ قران کی تعبیر نو پیش کریں اور یہ تعبیر و تفسیر ہر عہد کے علماء و مفکرین برابر کرتے ھی رہے ہیں ۔ اس جواب کی روشنی میں مصنفہ نے اپنے الزامی الفاظ میں کچھ تبدیلی کر دی ہے اور کہتی ہیں کہ اقبال بالکل شخصی قسم کی تاویل قران کرتے ہیں اور حسب مطلب معانی مراد لیتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر شیمل اقبال پر ذہنی بد دیانتی کا الزام تھوپنا چاھتی ہیں اور یہ کہنا چاھتی ہیں کہ اقبال اپنے نظریات کی تائید میں قران سے غلط استنباط کرتے ہیں ۔

(د) صفحہ VIII پر لکھتی ہیں :

''اقبال نے مغربی افکار کو اپنے تصور اسلام کے مطابق تبدیل کیا ہے ۔ یہاں پھر وھی الزام دھرایا گیا ہے کہ اقبال آیات قرانی

کے مطالب مسخ کرتے تھے اور مغربی افکار کو بھی تبدیل کر دیا کرتے تھے - جن اصحاب نے اپنی ساری عمر اقبال کو سمجھنے میں صرف کر دی ہے اُن کی نگاہ میں کم از کم اقبال وہ تو نہیں ہے جو مس شیمل پیش کر رہی ہیں -

(ر) صفحہ ۳۸۵ پر ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں :

''عیسائی قاری کو یہ دیکھ کر سخت دھچکا لگے گا کہ ہر عیسوی و یورپی چیز کی قدر کو اقبال نے اپنی تحریروں میں گھٹا کر پیش کیا ہے اور اقبال کو عیسوی اخلاقیات کے معیار سے بھی آگہی نہیں ہے - اقبال کو اُن مختلف مسالک کے اختلاف سے بھی دلچسپی نہیں ہے - اس لیے اُنہیں بھی اقبال نے اپنی تحریروں میں نہیں چھوا ہے - ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے عیسائی قاری کو یہ محسوس ہو جانا چاہیئے کہ ایک مورخ ادیان کے لیے جس روا داری و سکون تفکر کی ضرورت ہوتی ہے اقبال اس انداز کی بات نہیں کرتے -''

(ز) صفحہ ۳۸۵ پر ہے :

''مغرب پر اقبال کی نکتہ چینی بعض اوقات عہد وسطیٰ کے polemics مناظرے کی شکل اختیار کر لیتی ہے -''

موصوفہ کی ان تمام باتوں سے قاری یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اقبال کو ایک غیر منطقی اور جنونی ملا ثابت کرنا چاہتی ہیں جسے ہر مغربی اور عیسوی چیز میں عیب ہی عیب نظر آتا ہے اور کوئی کلمۂ خیر اُن کے باب میں اقبال کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتا اور یہ سب کچھ اُس شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس نے لکھا تھا :

''تاریخ حاضرہ کا سب سے محیر العقول واقعہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام روحانی طور پر بڑی سرعت کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے - اور اس حرکت میں کوئی برائی بھی نہیں ہے -''
(خطبات صفحہ ۷)

(س) بعض اوقات مصنفہ اقبال کو بدنام کرنے میں حد سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔ دکھانا یہ چاہتی ہیں کہ اقبال بڑا ہی قدامت پسند اور رجعت پسند تھا اور عورتوں کے باب میں ایک ''دقیانوسی'' مسلمان تھا۔ چنانچہ اقبال کے اس بیان کا سہارا لیا گیا ہے:

> ''وفاقی مقننہ میں عورتوں کے لیے نو نشستوں کا تعین ایک اور غیر مناسب پہلو ہے۔ ان نشستوں کا حلقۂ انتخاب مستقلاً غیر مسلم رہے گا اور مسلمان خواتین کے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ ان نشستوں پر قبضہ کر سکیں۔ مسلم خواتین کو اُن کی قوم کا جزو سمجھا جانا چاہیئے تھا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اقبال عورتوں کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے اور اس رائے کا مطلب بھی یہی تھا کہ وہ عورتوں کے کسی سیاسی حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ مصنفہ کی یہ منطق کس طرح صحیح ہے اس کو سمجھنا نا ممکن ہے۔ یہاں سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اگر عورتوں کی مخصوص نشستوں کے لیے ''جداگانہ انتخاب'' اڑا دیا گیا تو جو بھی نشستیں پر ہوں گی اُن پر ہندو عورتیں براجمان ہوں گی۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ عورتوں کو مذہب کے لحاظ سے نشستیں دے دی جائیں۔ یہ بات اس قدر صاف ہے کہ ایک مذہبی سودائی ہی اس سے غلط مطلب نکال سکتا ہے۔

(ش) صفحہ ۳۷۸ پر ارشاد ہوا ہے:

> ''فلسفۂ اقبال کی اسلامیت اس کے عالمی اثر و نفوذ میں حائل ہو جاتی ہے۔''

یہ اُس ہستی کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس نے اپنی وفات سے چند ہی ہفتے قبل ایک پیغام میں یہ تہدید دی تھی:

> ''یاد رکھیئے دنیا میں انسان تب ہی برقرار رہ سکتا ہے جب وہ احترام آدمیت کے آداب سے واقف ہو۔ یہ دنیا اُس وقت تک خوں خوار درندوں کی آماج گاہ بنی رہے گی جب تک تمام عالم

کی دانشور قوتیں مل کر انسان میں احترام آدمیت کا جذبہ پیدا کرنا شروع کر دیتیں۔"

موصوفہ نے اقبال کو بدنام کرنے کی جس انداز سے کوشش کی ہے اسے دیکھتے ہوئے ہمیں اقبال کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو یورپی مستشرقین کی بابت ایک دفعہ انہوں نے ظاہر کیے تھے :

"مجھے یورپی مستشرقین پر کوئی اعتماد نہیں کیونکہ ان کی تحریریں سیاسی پروپیگنڈے یا عیسوی تبلیغ کے مقاصد کے لیے ہی ہوتی ہیں۔"

سیاسی پروپیگنڈے کا عہد تو شاید اب ختم ہو چکا ہے، البتہ عیسائیت کے علم برداروں کی مشنری سرگرمیاں ابھی تک جاری ہیں۔

یہ تسلیم ہے کہ گو اس کتاب میں اقبال کے خلاف الزام تراشی کا کافی مواد دیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اس مفکر اسلام کی تعریف میں بھی بہت سے حصے آ جاتے ہیں اور عام قاری یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ مصنفہ اقبال کی بڑی مداح ہیں۔ مگر حقیقت میں نگاہیں یہ دیکھ سکتی ہیں کہ اپنے مقصود ذہنی کو چھپانے کے لیے مصنفہ نے چند مصطلحات کے دھواں دھار بادل پہلے ہی پھیلا دیئے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انہیں چیر کر دیکھا جائے۔ مثلاً ان کی ہر گفتگو میں "پیمبرانہ روح"۔ "پیمبرانہ فلسفی" اور "پیمبرانہ میلان" کے الفاظ ملیں گے اور "مسخ کرنے" کے سیدھے سادے لفظوں کی بجائے وہ جان بوجھ کر اور گھما پھرا کر بات کریں گی اور آپ "ذاتی تاویلات" کا خطاب دیں گی۔ مگر جو لوگ ان کی کتاب کو غور و تعمق سے پڑھیں گے وہ ایسے الفاظ کے دھوکے میں نہیں آئیں گے۔

اگر مصنفہ کی یہ باتیں مان لی جائیں کہ اقبال واقعی ایسا بد دیانت مفکر تھا کہ اس نے ایک عربی شاعر کی نظم کے معنی بدل دیئے اور اپنے مقصد کے لیے قرآنی آیات کی غلط تاویلیں کیں اور چونکہ ان کے پیغام کی روح اسلام ہے اس لیے وہ عالمی اپیل (حسن قبولیت) حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر ایسی تمام باتیں درست مان لی جائیں تو ہم فاضل مصنفہ سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ

آپ کا اس کتاب کے لکھنے سے مقصد و مدعا کیا ہے ؟ اور آپ نے اس کتاب کو انگریزی میں کیوں لکھا ہے جبکہ آپ کی اپنی مادری زبان جرمن ہے ؟ کیا وہ ہم پاکستانیوں کو جو اقبال کے دلی پرستار ہیں یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اقبال ایسا بھس بھسا اور پوچ شخص تھا ؟

اصل بات یہ ہے کہ موصوفہ کی کتاب تنقید ہے ہی نہیں ۔ ہم نقد و نظر کے ضرور قائل ہیں ، مگر وہ دیانت پر مبنی اور بالکل سیدھی سادی منطق میں ہونی چاہیئے ۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب بڑی مایوس کن ہے ۔ اس میں غلط بیانیاں ہیں ۔ یہ غلط معلومات سے لبریز ہے اور اس میں تراجم نہایت ناقص ہیں ۔

ہم موصوفہ کی علمی فضیلت کا احترام ضرور کرتے ہیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے :

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اقبال کا سنجیدگی سے مطالعہ ابھی چند سالوں سے ہی شروع کیا ہے ۔

کتاب کے ناشر ، مشہور کتب فروش ای ۔ جے ۔ برل (لیڈن) ہیں ۔ یہ کتاب Numen کے ضمیمے کے طور پر شائع کی گئی ہے ۔ یہ مجلہ ، ''مجلس تاریخ ہائے ادیان'' کا نفس ناطقہ ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مجلس کے پروفیسر ڈاکٹر سی ۔ جے بلیکر کی امداد و اعانت سے یہ سب کام ہوتا ہے ۔

کتاب کی طباعت نفیس ہے ، مگر افسوس کہ طباعت کی اغلاط بھی کافی ہیں کیونکہ اس نوع کی کتاب کا اس مقام پر چھاپنا بھی ایک مشکل کام تھا ۔